© rasailojaraid.com

جناب مسعود علی محوی

ابوالحسن رودکی

تیسری صدی ہجری کے آخری حصہ میں سلطنت عباسیہ بغداد کے عروج کا وہ ماہتاب جو سالہا سال تک نہایت آب و تاب کے ساتھ دنیا پر چمک چکا تھا ماند پڑنے لگا اور جوں جوں اس کی روشنی گھٹتی اور تاریکی بڑھتی گئی اسلامی دنیا کے مطلع پر دوسرے ستارے نمودار ہو کر اپنی چمک دمک دکھانے لگے صاف الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ سلطنتِ عباسیہ بغداد کی کمزوری نے ان صوبہ داروں اور حاکموں کو جو پشتہا پشت سے سلطنت کی فرمانبرداری اور خدمت گزاری کرتے چلے آئے تھے اور اسی کے دامنِ عاطفت میں پلے تھے قوی اور زور دار کر دیا۔ اور جس قدر سلطنت میں ضعف آتا گیا ان کی قوت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض خاندان مثلاً طاہریہ۔ صفاریہ۔ سامانیہ۔ دیلمیہ۔ غزنویہ اور سلجوقیہ وغیرہ سلطنتِ عباسیہ کی موجودگی ہی میں اس کی حقیقی فرمانبرداری کے دائرہ سے خارج ہو کر آزاد اور خود مختار شمار ہونے لگے۔

سامانیوں کا عروج

سامانیوں کا عروج مامون الرشید عباسی کے عہد سے شروع ہوتا ہے۔ مامون الرشید جو طبعاً یا مصالحِ ملکی کے لحاظ سے عموماً عجمیوں کی پرداخت اور پرورش کی طرف مائل تھا جب مرو پہنچا اور اپنے وزیر فضل بن سہیل کے چچازاد بھائی غسان بن عباد کو خراسان اور ماوراء النہر کا گورنر مقرر کیا تو اسد بن سامان ایک عجمی النسل سردار کے بیٹوں کو جو اس کے ملازم رکاب تھے غسان کے سپرد کر کے کہا کہ یہ لوگ عالیخاندان اور ذمہ داری کی خدمتوں کے لائق ہیں۔ خلیفہ کا اتنا اشارہ کافی تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں نوح بن اسد سمرقند، احمد بن اسد فرغانہ، یحییٰ بن اسد شاش وغیرہ اور الیاس بن اسد ہرات کی گورنریوں پر مامور ہو گئے اور رفتہ رفتہ اس قدر قوت حاصل کی کہ ان میں سے ایک شخص اسمٰعیل سامانی جو سلطنتِ عباسیہ کی طرف سے ایک مشہور باغی عمرو لیث کے مقابلہ پر مامور ہوا تھا اور بہت سی خدمات بجا لا چکا تھا، ماوراء النہر کا خود مختار حکمران سمجھا جانے لگا۔ اسمٰعیل عمرو لیث پر فتح پانے کے بعد تقریباً سات سال تک نہایت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عظمت و شان کے ساتھ حکومت کر کے انتقال کر گیا۔ اور اس کا بیٹا احمد بن اسمٰعیل اس کا جانشین ہوا۔ احمد ایک تند مزاج، بدزبان اور بدخلق بادشاہ تھا اور اس کی بدولت تقریباً چھ سال حکومت کر کے ۳۰۱ھ میں اپنے غلاموں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس وقت احمد کا بیٹا ابوالحسن نصر بن احمد بہت کم سن تھا مگر احمد بن محمد بن لیث شحنہ بخارا اور ابو عبداللہ محمد بن احمد وزیر کی بروقت کوششوں نے اس کم سن بچے کو امارت کی کرسی پر بٹھا دیا۔ اسحٰق بن اسمٰعیل کو جو خاندانِ سامانیہ میں اس وقت سب سے زیادہ معمر اور سمرقند کا پُر اثر حاکم تھا جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو اس نے اپنے بھتیجے پر لشکر کشی کا ارادہ کیا اور اپنے بیٹے کو نیا بتاً سمرقند کا حاکم مقرر کر کے خود ایک لشکر کثیر کے ساتھ بخارا کی طرف بڑھا۔ ادھر سے حمویہ نامی ایک افسر مقابلہ کے لیے بھیجا گیا۔ جو لڑائی نواح بخارا میں ہوئی اس میں حمویہ کو فتح ہوئی اور اسحٰق شکست کھا کر بھاگا۔ اسحٰق کو اس زک کا، جو اسے اپنے کم سن بھتیجے کے مقابلہ میں اٹھانی پڑی سخت صدمہ ہوا اور اپنے دامنِ عزت سے اس داغ کو مٹانے کے لیے اس نے بڑے اہتمام سے دوبارہ فوج کشی کی لیکن قسمت نے اس مرتبہ بھی یاوری نہ کی اور اس کو پھر شکست کھانی پڑی۔ اب کی بار حمویہ نے اس کا تعاقب کیا اور سمرقند پر جا کر قبضہ کر لیا۔ اور اسحٰق کو گرفتار کر کے دارالریاست بخارا میں لے آیا۔ کم سن امیر کو جو فتوحات اپنے تجربہ کار اور بااثر چچا کے مقابلہ میں حاصل ہوئیں اس کو لوگوں نے امیر کی خوش قسمتی پر محمول کیا اور اس کو امیر سعید کہنے لگے۔ اسحٰق کی متواتر شکستوں اور آخر کار اس کی گرفتاری سے لڑائیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ملک میں جو بدامنی اور بے اطمینانی آئے دن کی لڑائیوں سے پھیلی ہوئی تھی وہ رفع ہو گئی۔ امیر نصر جس نے اپنے باتدبیر عہدہ داروں اور حرب طلب امیروں کی گود میں پرورش پائی تھی بڑا ہو کر ایک سمجھدار، علم دوست، ہنر پرور اور فیاض امیر ثابت ہوا اور اس کی فیاضی اور رحم دلی کے بہت سے قصے بیان کیے جاتے ہیں۔

رودکی کی پیدائش

ماوراء النہر اور خراسان وغیرہ میں سلطنت سامانیہ اور خصوصاً امیر سعید کا زمانہ امن و آسایش اور عدل و انصاف کے لحاظ سے بہت اچھا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی مبارک زمانے میں نواح سمرقند سے وہ شخص اٹھا جس نے نظم فارسی کی اس عالیشان عمارت کی از سر نو بنیاد رکھی جو شاہان عجم کی سرپرستی میں تیار ہو کر حوادث کے بلاخیز طوفانوں اور تغیرات کی فتنہ انگیزی کی آندھیوں میں ایسی مسمار ہو گئی تھی کہ اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آثار اور علامات تک باقی نہ رہے تھے۔ یہ بنیاد کچھ ایسے نیک وقت اور مبارک ہاتھوں سے رکھی گئی تھی کہ روز بروز اس میں ترقی اور اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ پھر ایک عالیشان عمارت بن گئی جو دنیا کی اسی قسم کی عمارتوں میں خوشنمائی اور دل فریبی کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہے۔

اس شخص کا نام جسے موجودہ نظم فارسی کا بابا آدم کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا۔ عبداللہ اور کنیت ابوجعفر اور ابوالحسن اور لقب فریدالدین تھا اور اس کے باپ کا نام محمد بتایا جاتا ہے۔ یہ اعجوبہ روزگار تیسری صدی ہجری کے آخری حصہ میں پیدا ہوا۔ اگرچہ فطرت نے اس ہونہار بچہ کو ابتدا ہی سے بینائی کی نعمتِ عظمیٰ سے جس پر بڑی حد تک دنیا کے حظائظ اور لذائذ کا دارومدار ہے اور جو انسان کے احساس اور معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، محروم کردیا تھا۔ مگر فطرت نے اس کا معاوضہ طبیعت کی جودت خیال کی ندرت، ذہن کی استقامت اور حافظہ کی قوت سے کردیا۔

تعلیم و تربیت

اس زمانہ کے قاعدہ کے موافق ابوالحسن کی تعلیم بھی کلام مجید سے شروع ہوئی۔ چونکہ اس کے دل و دماغ کے خزانے ذہنی اور خداداد قوتوں سے مالامال تھے۔ آٹھ ہی سال کی عمر میں اس نے کلام مجید حفظ کرلیا اور فنِ نحو میں بھی اس کو اچھی دستگاہ ہوگئی۔ ان اعلیٰ دماغی قوتوں کے ساتھ ساتھ فطرت نے اس کو بے حد دلکش آواز دی تھی اور جب وہ خوش الحانی کے ساتھ کلام مجید پڑھتا تھا تو سننے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ ابتداً نقص بینائی کی وجہ سے اس ہوشیار بچہ کے والدین نے اس کی تعلیم و تربیت کے متعلق خواہ کچھ خیال کیا ہو مگر اس کم عمری میں یہ غیر معمولی ترقی اور کامیابی دیکھ کر ان کے خیالات ضرور بدل گئے ہوں گے اور وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ نایاب جوہر اس قابل نہیں ہے کہ بلا تراش و خراش اور بغیر جلا کے یوں ہی چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ ختم کلام مجید کے بعد بھی اس کی تعلیم و تربیت جاری رہی ہے یہاں تک کہ وہ اس زمانہ کے ضروری علوم و فنون میں ماہر ہوگیا جس کا پتہ اس کے اس قدر کلام سے بھی جو اس وقت موجود ہے بآسانی مل سکتا ہے۔ کسی ایسے شخص کی نسبت جس کے حالات کسی تذکرہ یا موجودہ تاریخ میں تین چار سطروں سے زیادہ نہ پائے جاتے ہوں یہ بتانا کہ اس کی تعلیم کس نوع کی تھی اور کن استادوں کے سامنے اس نے زانوئے ادب تہ کیا تھا محال ہے۔ متواتر تجربوں سے یہ امر بخوبی ثابت ہوچکا ہے کہ طبیعت کے اصلی رجحان کو تعلیم اور تربیت روک نہیں سکتے اور تعلیم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خواہ کسی طرح کی ہو لیکن طبیعت اپنا اصلی جوہر دکھائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

ابوالحسن رودکی جس کو فطرت نے موزوں طبیعت اور رنگین مزاج پیدا کیا تھا تعلیم کی قید سے آزاد ہو کر شعر و سخن اور گانے بجانے کی طرف مائل ہو گیا اور اس کی پُر زور اور بے چین طبیعت اپنا اصلی رنگ دکھانے لگی۔

علم و فن کی سرپرستی

اس وقت اسلامی دنیا پر خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس کی آزاد خیالی اور فیاضی سے علوم لطیفہ اور فنون ظریفہ کا رنگ چڑھ چکا تھا اور ان کے دربار کے مشہور عالموں۔ فاضلوں مصنفوں۔ شاعروں اور موسیقی دانوں کی یاد ابھی تازہ تھی۔ گو اب بغداد ہارون الرشید اور مامون الرشید کے زمانہ کا بغداد نہ رہا تھا مگر پھر بھی علم و فضل کی صحبتیں اور شعر و سخن کے جلسے جا بجا قائم تھے۔ مقتدر باللہ جو خلفائے عباسیہ میں بوقتِ تختِ نشینی سب سے زیادہ کمسن تھا اگرچہ خلیفہ ہوتے ہی عیش و عشرت میں پڑ گیا تھا مگر علم و فن کی سرپرستی سے غافل نہ تھا اور جو خزانے خلفائے سابق چھوڑ گئے تھے، وہ مذہبی صدقات اور شعراء کے انعام و اکرام میں بے دریغ صرف کر رہا تھا۔ مصر پر خاندان اخشیدیہ، فارس اور عراق پر دیالمہ، ماوراء النہر اور خراسان پر خاندان سامانیہ، شام میں آلِ حمدان اور دوسرے چھوٹے چھوٹے قطعات پر دوسرے خاندان متصرف تھے ان لوگوں میں سے جو اس وقت صوبہ داروں کی حیثیت سے آہستہ آہستہ خود مختار حکمرانی کی طرف بڑھ رہے تھے اکثر خود ذی علم اور صاحبِ فضل تھے اور بغداد کے بابرکت علمی صحبتوں اور شعر و سخن کے پرلطف جلسوں میں شریک رہ چکے تھے۔ ایسی حالت میں ان کا علم دوست اور ہنر پرور نہ ہونا تعجب انگیز ہوتا۔ بعض ان میں سے عجمی النسل امیر تھے جن کی مادری زبان فارسی تھی۔ اس لیے فطرتی طور پر ان کی یہ کوشش ہونی چاہیے تھی کہ ان کی مادری زبان بھی تالیف و تصنیف کی برکت سے محروم نہ رہے اور جو وقعت اس لحاظ سے اس وقت عربی زبان کو حاصل تھی وہی اس کو حاصل ہو جائے۔ امرائے آلِ لیث اور آلِ سامان وغیرہ کی اس کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ زبانِ فارسی جو فتح اسلام کے بعد سے ایک کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی پھر چمک گئی اور اس میں پھر تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسرے علوم و فنون سے قطع نظر کر کے خاص زمرۂ شعرا میں حکیم حنظلہ بادغیسی۔ حکیم فیروز مشرقی۔ ابو سلیک گرگانی۔ شیخ ابوالحسن شہید بلخی۔ ابو شکور بلخی۔ ابو شعیب صالح بن محمد ہروی۔ شیخ ابو العباس الفضل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بن احمد۔ شیخ ابوذر معمر جرجانی۔ ابوالمظفر ناصر بن محمد نیشاپوری۔ ابوعبد اللہ محمد بن عبد اللہ جنیدی۔ ابوالمنصور عمارہ بن محمد مرزوی۔ ابوالموید بخاری جیسے مستعد لوگ پیدا ہوگئے۔ مگر ان سب میں شہرتِ عام اور بقائے دوام کا سہرا ابوالحسن رودکی ہی کے سر رہا۔

زمرۂ ندماء میں رودکی کی شرکت

شاعری کی ابتدا ہر ملک اور ہر زمانہ میں موسیقی سے ہوئی ہے نہ موسیقی بغیر موزوں کلام کے مزہ دے سکتی ہے۔ اور نہ موزوں کلام بغیر موسیقی کی مدد کے اپنا پورا اثر دکھا سکتا ہے۔ ان دونوں فنون کا قدیم سے چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان میں سے کسی ایک فن کو جاننے والے کا دوسرے فن کی طرف مائل ہوجانا نہایت آسانی سے ممکن ہے۔ ابوالحسن رودکی جیساکہ اوپر بیان ہوا فطرت سے موزوں طبیعت اور دلکش آواز لے کر آیا تھا۔ سوسائٹی کے خیالات بھی علم موسیقی کی تحصیل اور تکمیل میں زیادہ مانع نہ تھے کیونکہ ابھی پوری ایک صدی نہ گزری تھی کہ ہارون الرشید جیسے باعظمت و جلال خلیفہ کا بھائی ابراہیم بن مہدی اور اس کی بہن علیا اس فن میں سربرآوردہ ہوکر انتہائی ناموری حاصل کرچکے تھے۔ اس لیے ابوالحسن رودکی کا اس فن کی طرف مائل ہونا کوئی عیب نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ موسیقی سے لگاؤ نے اس کی شاعری کو جو اس کے متقدمین اور معاصرین سے بڑھی ہوئی تھی اور زیادہ چمکا دیا۔ اس کے مقابلہ میں کسی ایسے شخص کا فروغ پاتا جو صرف ایک ہی پہلو کو سنبھالے ہوئے ہو مشکل تھا۔ اس کی بذلہ سنجی، رنگین مزاجی، خوش آوازی اور حاضر جوابی نے امرائے بخارا کی رنگین صحبتوں کے دروازے اس کے لیے کھول دیے۔ کوئی رنگین صحبت بغیر اس کی موجودگی کے کامل نہ سمجھی جاتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی خوش کلامی اور اس کی خوش آوازی کی تمام بخارا میں دھوم مچ گئی۔ یہ شہرت رفتہ رفتہ نصر بن احمد امیر بخارا کے کان تک پہنچی اور وہ بھی رودکی سے ملنے اور اس کے دیکھنے کا مشتاق ہوا۔ اب کیا باقی تھا۔ ابوالحسن رودکی فوراً طلب ہوکر امیر کے سامنے پیش کیا گیا اور امیر نے اس کے جوہرِ فضل و کمال پر فریفتہ ہوکر اسے اپنے ندماء میں شریک کرلیا۔ اور وہ تھوڑے ہی زمانہ میں اپنی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور مزاج شناسی کی بدولت امیر کے مزاج میں بے حد دخیل ہوگیا اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ امیر کو اس کے بغیر چین نہ آتا تھا۔ امیر کی اس قربت نے رودکی کی ظاہری حیثیت میں ایک تغیرِ عظیم پیدا کردیا۔ امرائے دولت اور ارکانِ سلطنت جن کی صحبت اور اعانت کا وہ اس وقت تک محتاج تھا اب اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی صحبت اور اعانت کے محتاج ہو گئے اور اس کی ہم نشینی اور اس کی خدمت اپنا فخر سمجھنے لگے۔ نظامی عروضی اپنی کتاب چہار مقالہ میں ایک دلچسپ حکایت نقل کرتا ہے جس سے ان واقعات کی پوری تائید ہوتی ہے۔

نظامی عروضی لکھتا ہے کہ نصر بن احمد کے زمانہ میں آل سامان کی سلطنت زوروں پر تھی۔ ملک مرفعہ الحال اور آسودہ تھا اور ہر طرف عیش و عشرت کے سامان مہیا تھے۔ امیر کی عادت تھی کہ جاڑے دار الریاست بخارا میں گزارتا تھا اور گرمیوں میں سمرقند یا خراسان کے شہروں میں سے کسی ایک شہر میں جا کر رہتا تھا۔ ایک سال موسم بہار میں ہرات کی نوبت آئی اور بادغیس کی چراگاہ میں جو برار بادیہ کے قریب واقع ہے اور تمام خراسان اور عراق کی چراگاہوں میں زیادہ سرسبز اور شاداب ہے ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ جب شاہی اصطبل کے گھوڑے بادغیس کی دوب کھا کر تازہ دم ہو گئے اور امیر نے ہرات کا رُخ کیا اور شہر کے باہر ایک پرفضا سبزہ زار میں اتر پڑا۔ خیمے لگا دیے گئے۔ موسم بہار کی ہوائیں چلنے لگیں اور مالکن اور کروخ کے بے مثل میوے پکنے لگے۔ عشرت خیز موسم، سرد ہوا، بے فکری کا زمانہ، میووں کی کثرت، پھولوں کی فراوانی، بہار اور گرمیوں کا موسم نہایت آرام سے گزر گیا۔ خزاں کے ساتھ ساتھ انگوروں پر بہار آئی۔ لشکر کے لوگ ناز و نعم اور عیش و عشرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ اتفاق سے اس سال سردی چمک گئی اور انگور رس پر آ گئے۔ نواح ہرات میں ایک سو بیس مختلف قسم کے انگور ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو قسمیں ایسی ہیں جن کی نظیر دنیا کے پردہ پر ملنا مشکل ہے۔ ایک تریناں اور دوسرا کلنجدی۔ جن کا ایک ایک خوشہ پانچ پانچ سیر کا ہوتا ہے۔ یہ سیاہ رنگ باریک پوست کے نہایت شاداب، اور اس قدر شیریں ہوتے ہیں کہ ان کے کھانے میں لب بند ہوتے ہیں۔ یہی حال دوسرے میووں کا ہے۔ امیر نصر بن احمد یہ میوے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ نرگس کے پھولنے کا بھی زمانہ آ گیا۔ مالکن میں منقے بنانے کا اہتمام ہونے لگا۔ الگنیاں باندھی گئیں۔ اور لوگوں نے انگور سکھا کر تھیلے بھر لیے۔ اس کے بعد امیر لشکر سمیت اس قصبہ کی طرف روانہ ہوا جو غورہ اور درداز کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا ہر ایک مکان بہشت بریں کا نمونہ تھا۔ ہر مکان کے سامنے پرفضا باغ اور چمن تھے۔ جاڑوں بھر وہاں رہا۔ سیستان کی طرف سے نارنگیاں اور مازندران کی طرف سے ترنج آنے لگے۔ جاڑے بھی آرام سے گزر گئے۔ پھر بہار آئی اور امیر نے حسب معمول اپنے گھوڑے بادغیس کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھیج دیے اور شاہی کیمپ بمقام مالکن دو ندیوں کے درمیان قائم کیا گیا - گرمیوں کے ساتھ پھر میوے آگئے اور امیر نے ارادہ کیا کہ اس بار بھی فصل کے میووں کے مزے اٹھائیں - غرض کہ اسی طرح چار سال گزر گئے - اگرچہ دولتِ سامانیہ کا عروج تھا - جہان آباد، ملک پُرامن، لشکر فرمانبردار، زمانہ مساعد اور بخت موافق، مگر باوجود اس کے امیر کے ہمراہی طولِ قیام سے گھبرا گئے اور وطن کی یاد نے ان کو بے چین کر دیا - انھوں نے دیکھا کہ امیر کو ہرات کے ساتھ عشق ہو گیا ہے اور بات بات میں وہ ہرات کو بہشتِ عدن اور بہارِ چین پر ترجیح دیتا ہے اور اس کی گفتگو سے پایا جاتا تھا کہ آیندہ گرمیاں بھی وہ وہیں گزارنا چاہتا ہے - یہ بے چارے گھبرا گئے اور فوج کے تمام افسر اور امیر کے تمام ساتھی ابوالحسن رودکی کے پاس آئے جو اس وقت امیر کے ندما میں سب سے زیادہ مقرب اور مقبول القول سمجھا جاتا تھا اور اس سے کہا کہ اگر آپ کوئی ایسی تدبیر کریں کہ امیر بخارا کا قصد کرے تو ہم لوگ پانچ ہزار دینار آپ کی نذر کریں گے - رودکی نے جو امیر کے مزاج میں پورا دخیل تھا اس کو منظور کر لیا - مگر وہ خوب سمجھے ہوئے تھا کہ اس موقعہ پر محض نثر سے کام چلنا محال ہے اس لیے اس نے نظم سے مدد لی اور فوراً ایک قصیدہ تیار کیا اور جب امیر صبوحی کر کے بیٹھا تھا وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور آداب بجا لا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا - امیر کے سامنے گانا ہو رہا تھا - جب گویّے گانے سے فارغ ہوئے تو اس نے چنگ اٹھا کر پردہ عشاق میں یہ قصیدہ چھیڑ دیا:

بوئے جوئے مولیاں آید ہمے ‌ ‌ ‌ یادِ یارِ مہربان آید ہمے
ریگِ آموی و درشتیہائے او ‌ ‌ ‌ زیر پایم پرنیاں آید ہمے
آبِ جیحوں از نشاطِ روی دوست ‌ ‌ ‌ چنگ مارا تا میاں آید ہمے
اے بخارا شاد باش و شاد زی ‌ ‌ ‌ میر سویت شادماں آید ہمے
میر سرو است و بخارا بوستان ‌ ‌ ‌ سرو سوئے بوستاں آید ہمے

جب رودکی اس شعر پر پہنچا تو امیر وطن کی یاد میں اس درجہ بے خود ہو گیا کہ تخت سے اتر کر فوراً خاصہ کے گھوڑے پر (جو ہمیشہ بادشاہ اور امرا کے دروازوں پر باری باری سے حاضر رکھے جاتے تھے) سوار ہو کر بخارا کی طرف چل کھڑا ہوا - اور دو فرسنگ تک اتنا نہ ٹھہرا کہ پاؤں میں موزہ پہن سکے - امرائے دولت نے خوش ہو کر رودکی کو پانچ ہزار دینار نذر کیے - امیر نصر اور اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امرا کی فیاضی نے رودکی کو مالا مال کر دیا تھا۔

نظامی عروضی اسی حکایت کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ ۵۰۴ھ میں میں نے دہقان ابورجا سے سنا کہ جب رودکی اس سفر کے بعد سمرقند کو واپس آیا تو اس کے ساتھ چار سو اونٹ صرف اسباب سے لدے ہوئے تھے۔" مولانا جامی اسی واقعہ کی طرف اشارہ کر کے سلسلۃ الذہب میں فرماتے ہیں:

رودکی آنکہ درہمی سفتی — مدح سامانیاں ہمی گفتی

چون بآں قوم ہم سفر می رفت — نہ بآئین مختصر می رفت

صلۂ نظم ہائے ہم چو درش — بود در بار چار صد شترش

ایک قصیدہ کے متعلق دو تذکرہ نویسوں کی مختلف رائے

دولت شاہ سمرقندی جو کہ نویں صدی ہجری میں پیدا ہوا تھا اپنے تذکرہ میں اسی واقعہ کو بیان کر کے لکھتا ہے کہ سمجھدار لوگوں کو تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اس سیدھی سادی نظم میں جو صنایع بدایع اور متانت سے عاری ہے کیا ایسی بات تھی جس نے نصر بن احمد کو اس قدر بے خود کر دیا۔ اگر اس زمانہ میں کوئی شخص ایسی نظم بادشاہوں یا امیروں کے دربار میں پڑھے تو وہ پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ مگر رودکی نے جو کہ علم موسیقی میں کامل استاد تھا ممکن ہے کہ ان اشعار کو کسی خاص لے یا دھن میں پڑھا ہو اور اس نے کوئی خاص اثر پیدا کیا ہو۔ القصہ محض اس ایک قصیدہ کی بنا پر رودکی کی استادی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کا علم و فضل مسلم ہے۔ برخلاف اس کے نظامی عروضی جو دولت شاہ سمرقندی سے مقدم اور خود بھی پختہ مغز شاعر ہے، اسی قصیدہ کے متعلق لکھتا ہے کہ رودکی کی جتنی قدر کی جاتی کم تھی کیونکہ اس قصیدہ کا آج تک کسی نے جواب نہیں لکھا اور نہ کسی کی مجال ہے کہ اس تنگ اور دشوار گزار راستہ میں قدم رکھ سکے۔ عجم کے شیریں کلام لوگوں میں ایک امیر الشعرا معزی ہے جس کے کلام میں طراوت اور حلاوت کے ساتھ بے حد عذوبت اور روانی ہے زین الملک ابو سعد مندو بن محمد منور الاصفہانی نے اس سے اس قصیدہ کا جواب لکھنے کی فرمائش کی۔ لیکن اس سے نہ ہو سکا۔ معزی کا مطلع ہے۔

رستم از مازندران آید ہمے — زین الملک از اصفہان آید ہمے

جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں اور رودکی کے کلام میں کیا فرق ہے اور اس شیرینی کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیساکہ رودکی نے مدح میں کہا ہے کون کہہ سکتا ہے:

آفرین و مدح سود آید ہمے گر بگنج اندر زیاں آید ہمے

اسی ایک بیت میں سات خوبیاں اور صفتیں موجود ہیں۔ اول مطابق۔ دوم متضاد۔ سوم مترادف۔ چہارم بیان مساوات۔ پنجم عذوبت۔ ششم فصاحت۔ ہفتم جزالت۔ جن لوگوں کو فنِ شعر میں تبحر اور بصیرت ہے وہ اگر غور کریں گے تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ بالکل صحیح اور درست ہے۔

نظم کلیلہ و دمنہ

زبانِ سنسکرت میں قدیم سے اخلاقی حکایتوں کے چند مجموعے رائج تھے جن میں سے ایک کا نام پنچ تنتر تھا۔ دانایانِ ہند نے ان سیدھے سادے قصوں اور حکایتوں کے ضمن میں اس زمانہ کے علم اخلاق، سیاستِ مدن اور تدبیرِ منزل کے معلومہ اور مسلمہ اصول اور مقولے نہایت عمدگی اور خوبصورتی سے ظاہر کیے تھے اور ان کو عام فہم کرنے اور دلچسپ بنانے کے لیے وہ سب چرندوں اور پرندوں کی زبانی بیان ہوئے تھے۔ ان مجموعوں کی شہرت رفتہ رفتہ ایران تک پہنچی اور خسرو نوشیروان نے ایک شخص برزویہ نامی کو خاص طور سے ہندوستان بھیجا۔ یہ شخص چند سال تک ہندوستان میں رہا اور اس قسم کی چند حکایتوں اور قصوں کا زبان پہلوی میں ترجمہ کرا کے اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ ترجمہ ساسانیوں میں نہایت قیمتی اور فلسفہ تمدن کا اعلیٰ درجہ کا نمونہ سمجھا جاتا تھا اور اس قدر عزیز تھا کہ خزانہ شاہی میں مثل بے بہا جواہرات کے رکھا جاتا تھا۔ فتح اسلام کے بعد یہ نسخہ رفتہ رفتہ خلیفہ منصور عباسی (۱۳۶-۱۵۸ھ) کے ہاتھ لگا اور اس نے اپنے دربار کے ایک عجمی النسل فاضل عبداللہ بن مقفع سے جو پہلوی زبان کا بڑا ماہر تھا اس کا ترجمہ عربی میں کرایا۔ دوسرا عربی ترجمہ خلیفہ مہدی (۱۵۸-۱۶۹ھ) کے عہد میں یحییٰ بن خالد برمکی کی فرمائش سے عبداللہ بن ہلال اہوازی نے کیا اور سہیل بن نوبخت نے اسی زمانہ میں اسے نظم کا پیرایہ پہنایا۔ امرائے سامانی ایسے امور میں خلفائے بغداد اور ان کے امیروں کے قدم بقدم چلنا چاہتے تھے چنانچہ جب ان کا دور ہوا تو نصر بن احمد نے اپنے ندیم اور اپنے دربار کے مشہور شاعر رودکی کو حکم دیا کہ وہ اس کا ترجمہ نظمِ فارسی میں کرے۔ رودکی نے جو ترجمہ کیا غالباً وہ انہی عربی ترجموں میں سے کسی ایک سے کیا ہوگا۔ چونکہ رودکی کا ترجمہ نظم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں تھا اس لیے غالب یہی ہے کہ وہ سہیل بن نوبخت کے منظوم ترجمہ سے کیا گیا ہوگا۔ اگرچہ ملا حسین واعظ کاشفی (۹۱۰ھ) نے اپنی کتاب انوارِ سہیلی میں لکھا ہے کہ نصر بن احمد نے اپنے زمانہ کے ایک فاضل کو حکم دیا اور اس نے کلیلہ و دمنہ کا عربی سے زبانِ فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کو رودکی نے منظوم کیا۔ لیکن یہ موجودہ تحقیقات کے خلاف ہے۔ اس وقت تک جو کچھ دریافت ہوا ہے وہ یہی ہے کہ پہلا ترجمہ جو عربی سے زبانِ فارسی میں ہوا وہ ابو المعالی کا ترجمہ ہے جو بہرام شاہ بن مسعود غزنوی کی سرپرستی میں کیا گیا تھا۔ بعض یورپین مصنفوں نے رودکی کے منظوم ترجمہ کا ماخذ ابو المعالی کا ترجمہ بتایا ہے جو بالکل غلط ہے۔ رودکی کا ترجمہ ۳۲۰ھ میں ختم ہو چکا تھا اور ابو المعالی کا نشوونما تقریباً دو سو برس کے بعد ہوا ہے[۱]۔ غرضکہ ترجمہ خواہ عربی سے ہوا ہو یا فارسی سے۔ رودکی کی استادی اور زورِ طبیعت سے بہت مطبوع اور بامزہ ہوا اور امیر نصر نے اس کے صلہ میں رودکی کو چالیس ہزار درہم نذر کیے۔ عنصری اپنے ایک قصیدہ میں اس صلہ کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے:

چہل ہزار درہم رودکی ز مہترِ خویش عطا گرفت بہ نظمِ کلیلہ در کشور

زمانہ نے جو سلوک اصل سنسکرت کے مجموعوں اور ابتدائی پہلوی ترجمہ کے ساتھ کیا اس سے رودکی کا منظوم ترجمہ بھی نہ بچ سکا۔ اگر کلیلہ و دمنہ کی موجودہ ضخامت سے اندازہ کیا جائے تو اس امر کے تسلیم کرنے میں کچھ تامل نہیں ہوسکتا کہ رودکی کی اس مثنوی میں ساٹھ ہزار اشعار سے کم نہ ہوں گے۔ مگر اس وقت افسوس ہے کہ ان میں سے دس پانچ شعر بھی نمونہ کے لیے موجود نہیں اور یہ بھی معلوم کرنا مشکل ہے کہ یہ مثنوی کس بحر اور وزن میں تھی۔ صاحبِ فرہنگِ جہانگیری نے چند مختلف مثنوی کے شعر رودکی کی طرف منسوب کیے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک شعر یہ ہے:

داشتے آں تاجرِ دولت شعار صد قطار سار اندر زیر بار

بعض محققین کا خیال ہے کہ غالباً یہ اسی مثنوی کا شعر ہے۔

لفظ رودکی کی تحقیق

لفظ رودکی کے متعلق تذکرہ نویسوں میں بڑا اختلاف ہے۔ بعض نے اس کا ماخذ "رود" قرار دیا ہے۔

[۱] مخدوم و مکرم شمس العلما مولوی سید علی صاحب بلگرامی نے جو لکچر کلیلہ و دمنہ کے متعلق ایجوکیشنل کانفرنس میں دیا تھا اس میں یہی غلطی موجود ہے۔ (محوی)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو کہ ایک باجے کا نام ہے۔ اور چونکہ ان کے خیال کے موافق ابو الحسن اس باجے کے بجانے میں بڑا استاد تھا۔ اس لیے اس لقب سے ملقب ہوا۔ دوسرا فریق کہتا ہے کہ رودک نواحِ بخارا میں ایک قصبہ ہے جہاں ابو الحسن پیدا ہوا تھا اور اسی کی نسبت سے رودکی کہلانے لگا۔ اوّل تو کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ابو الحسن کو رود کے بجانے میں کوئی خاص ملکہ تھا۔ دوسرے اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے تو عام قاعدہ کے مطابق بحالت نسبت یہ لفظ رودی ہونا چاہیے تھا نہ کہ رودکی کافِ تصغیر کے ساتھ۔ برخلاف اس کے جغرافیہ سے ثابت ہے کہ نواحِ سمرقند میں (نہ کہ بخارا میں جیسا کہ عام طور سے تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے) رودک کے نام سے ایک قصبہ مشہور تھا۔ امام یاقوت حموی بغدادی جنھوں نے ساتویں صدی ہجری میں انتقال کیا، اپنی مشہور کتاب معجم البلدان میں قریہ بنج کے متعلق لکھتے ہے:

بنج۔ بالفتح ثم الضم و جیم۔ من قری رودك من نواحی سمرقند وهی قصبة ناحیة رودك من هذه القریه كان ابوعبدالله الرودكی الشاعر

علامہ سیوطی (۹۱۱) کے لب اللباب سے بھی اس قصبہ کا وجود ثابت ہے۔ علاوہ اس کے قدیم تذکروں میں شعرا کے نام کے ساتھ ان کا توطن عام طور سے ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً حکیم حنظلہ بادغیسی، حکیم فیروز مشرقی، شیخ ابو الحسن بلخی، ابو شعیب ہروی، ابو موید بخاری وغیرہ۔ لیکن ابو الحسن کے نام کے ساتھ بجز رودکی کے اور کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ اس لیے لفظ رودکی کو رودک کے سوائے جس کو ابو الحسن کا وطن سمجھنا چاہیے کسی اور طرف منسوب کرنا ہرگز صحیح نہ ہوگا۔

تخلص کی نسبت قیاس

اسی لفظ کے متعلق دوسرا امر قابلِ غور یہ ہے کہ آیا وہ تخلص ہے یا نہیں۔ اور تخلص کا دستور جو اس سے قبل کسی ملک اور قوم میں نہ تھا اہلِ فارس میں کب اور کس طرح جاری ہوا۔

تخلص عربی لفظ ہے اور اصطلاحِ نظم میں تخلص یا تخلیص کے معنی تمہید یا تشبیب سے اصل مضمون کی طرف متوجہ ہونے کے ہیں جس کو فارسی میں گریز کہتے ہیں۔ چونکہ شعرائے فارسی میں ابتداً زیادہ تر قصیدہ گوئی کا رواج تھا اور تخلص عموماً قصیدہ کا آخری یا انتہائی جزو ہوتا تھا، اس لیے غلطی سے عوام میں اس کے معنی قصیدہ کے آخری جزو یہاں تک کہ اخیر شعر کے سمجھے جانے لگے۔ عوام کو جانے دیجیے۔ سراج الدین خان آرزو جیسے محقق بھی اپنی کتاب چراغ ہدایت میں فرماتے ہیں کہ تخلص اس شعر کو بھی کہتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے (جو عموماً آخر شعر ہوتا ہے) اور اس پر کمال کا یہ شعر بطور سند کے پیش کرتے ہیں:

کمال از گفتۂ خود ہرچہ داری — تخلص ہائے تو بس نامدار است

غالباً انہی مجازی معنوں سے رفتہ رفتہ تخلص کا اطلاق اس لقب پر ہونے لگا جو شعرا اپنے لیے مقرر کر لیتے ہیں اور عموماً آخری شعر میں لاتے ہیں۔ عربی میں اس لفظ کا استعمال ان معنوں میں کہیں نہیں ہوا ہے جس وقت فارسی کی موجودہ شاعری کی بنیاد پڑی اس وقت دنیا میں بظاہر کوئی ایسی قوم نہ تھی جس کے شعرا میں تخلص کا دستور ہو اور یہ سمجھا جا سکے کہ اہل فارس نے یہ طریقہ ان سے سیکھا ہوگا۔ اس ایجاد کو ہو کر تقریباً ایک ہزار برس کا زمانہ گزر چکا ہے مگر بجز ان قوموں کے جن کی شاعری کا ماخذ فارسی شاعری ہے اور کسی قوم میں اس کا مطلق دستور نہیں ہے۔ خود عربوں میں جن کی شاعری سے موجودہ فارسی شاعری پیدا ہوئی تخلص کا طریقہ نہ تھا۔ اول تو یہ لوگ اپنی نظم میں اپنا نام داخل کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے اور جب کبھی بہ لحاظ مضمون کے اس کی ضرورت واقع ہوتی تھی تو اپنا معمولی نام استعمال کرتے تھے۔ امرا القیس بن حجر الکندی جو زمانہ جاہلیت کے شعرا میں ایک نہایت مشہور اور نامور شاعر گزرا ہے، اپنے ایک قصیدہ میں جو سبعہ معلقہ میں شامل ہے ایک جگہ کہتا ہے:

تقول وقد مال الغبیط بنا معا — عقرت بعیری یا امرء القیس فانزل

[جب ہم دونوں کے بوجھ سے ہودج ایک طرف جھکا جاتا تھا تو وہ (معشوقہ) کہتی تھی کہ اے امرا القیس تو نے میرے اونٹ کی پیٹھ لگا دی]

دوسرا شاعر لبیدؔ بن ربیعہ العامری ایک جگہ اپنی طولِ عمر کی شکایت کرتا ہے:

ولقد سئمت من الحیاۃ وطولھا — وسوال ھذا الناس کیف لبید

(میں گھبرا گیا زندگی اور اس کی طوالت سے اور آدمیوں کے اس سوال سے کہ لبید کیسا ہے)

چونکہ عربوں کے نام عموماً مختصر ہوتے تھے اس لیے جب کبھی ایسی ضرورت واقع ہوتی تھی تو ان کے نام بلا تکلف اور آسانی کے ساتھ نظم میں آجاتے تھے۔ لیکن ظاہری تکلّفات کی زیادتی اور دوسری اقوام کے اختلاط سے کچھ عرصہ کے بعد یہ سادگی باقی نہیں رہی اور اکثر ایسے نام رکھے جانے لگے جن کا اسی قدر آسانی کے ساتھ نظم میں داخل ہونا ممکن نہ تھا اس لیے جب عجمی النسل مسلمانوں نے فارسی میں شاعری شروع کی تو کم سے کم ان لوگوں کو جن کے بڑے بڑے نام تھے اس قسم کی ضرورتوں کے لحاظ سے ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسے مختصر نام کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی جو نظم میں آسانی کے ساتھ کھپ جائے اور اسی کو ایجادِ تخلص کی بنا سمجھنا چاہیئے اگرچہ ٹھیک طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ ابتداً ایسا نام کس نے اور کس زمانہ میں اختیار کیا۔ شعرائے آلِ طاہر اور آلِ لیث وغیرہ کی اس فہرست کے دیکھنے سے جو اوپر دی جا چکی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کا کوئی تخلص نہ تھا اور اس لیے ظاہری قیاس یہی ہے کہ رودکی بھی رکھا ہوا تخلص نہ تھا۔ چونکہ ابوالحسن نے اپنے کلام کی وجہ سے بے حد شہرت پائی اور اس زمانہ کے بچے بچے کی زبان پر اس کا نام تھا اس لیے کثرتِ استعمال سے جیسا کہ عام طور سے ہوتا ہے وہ بجائے عبداللہ یا ابوالحسن رودکی کے صرف رودکی کے نام سے پکارا جانے لگا اور اسی شہرت کی بنا پر ممکن ہے کہ اس نے خود بھی اپنے کلام میں بجائے اپنے پورے نام کے محض رودکی پر اکتفا کیا ہو اور اسی کی تتبع اور تقلید میں اس کے معاصرین اور متاخرین نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہو۔ کیونکہ رودکی کے معاصرین مثلاً ابوالحسن شہید اور ہروی سے بعد کے لوگوں مثلاً منصور بن احمد دقیقی اور ابوالقاسم فردوسی کے ناموں کے ساتھ ایسے لقب پائے جاتے ہیں جو بظاہر تخلص معلوم ہوتے ہیں۔ اگر یہ قیاس صحیح ہے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فارسی شعرا میں رودکی ہی وہ شخص ہے جس کے زمانہ میں نظم کی ابتدائی اصلاح اور تہذیب کے ساتھ ساتھ تخلص بھی ایجاد ہوا۔ گو اس کو لازمی طور سے مقطع میں استعمال کرنے کا طریقہ ایک عرصہ کے بعد رائج ہوا ہے۔

کلام کی نوعیت اور مقدار

رودکی کا کلام فی زمانہ نایاب ہے جستہ جستہ جو کلام ملتا ہے اس میں قصیدہ، غزل، مثنوی، قطعات اور رباعیات کے اشعار پائے جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ برخلاف متقدمین اور اپنے معاصرین کے جن کی شاعری عموماً قصیدہ گوئی تک محدود تھی، وہ تمام اصنافِ سخن پر قادر اور ساتھ ہی اس کے بہت پُرگو تھا۔ شرح یمینی میں اس کے اشعار کی تعداد دس لاکھ اور تین سو بیان کی گئی ہے لیکن استاد رشیدی نے اُن کی تعداد تیرہ لاکھ تک پہنچا دی ہے جیسا کہ اس کے اشعار ذیل سے ظاہر ہوتا ہے:

گر سری یابد بعالم کس بہ نیکو شاعری   رودکی را بر سر آن شاعراں زیبد سری

شعر او را من شمردم سیزدہ رہ صد ہزار   ہم فزوں تر آید ار چنانکہ باید بشمری

بعض تذکرہ نویسوں نے رودکی کو قصیدہ، مثنوی اور غزل کا بانی لکھا ہے۔ چونکہ یہ تینوں اصناف

© rasailojaraid.com

کلام رودکی سے پہلے بھی موجود تھے اس لیے اس کے معنی صرف یہی سمجھے جا سکتے ہیں کہ اس نے ان اصناف

© rasailojaraid.com

کلام میں اصلاحات اور اختراعات کیے ہیں لیکن چونکہ اس کے پہلے کا اور خود اس کا کلام کافی مقدار میں موجود نہیں ہے اس لیے ان اصلاحات اور اختراعات کی نوعیت معلوم ہونی مشکل ہے۔ بہرحال اس کا تقدم اور اس کی فضیلت مسلّم ہے اور اس کی تصدیق ہر طبقہ کے شعرا کرتے رہے ہیں۔ بداہتہً اور کنایتہً چند ایسے شعر جن میں مختلف شعرا نے اس کا تذکرہ کیا ہے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں :

چہل ہزار درم رودکی ز مہترِ خویش — عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور (عنصری)

گر سرے یابد بعالم کس بہ نیکو شاعری — رودکی را بر سر آں شاعراں زیبد سری (رشیدی)

اگر بدولت با رودکی نہ ہمسانم — عجب مکن سخن از رودکی نہ کم دانم
اگر بکوری چشم او بیافت گیتی را — زہر کہ گیتی من کور بود نتوانم
ہزار یک زانکو یافت از عطائی ملوک — بمن دہی سخن آید ہزار چندانم (ابوذراعہ جرجانی)

اے آنکہ طعنہ کردی با شعر رودکی — ایں طعنہ کردن تو ز خیل است و کودکی است
کانکس کہ شعر داند او داند کہ در جہان — صاحبقرانِ شاعری استاد رودکی است (نظامی عروضی)

رودکی آنکہ دُر ہمی سفتی — مدح سامانیاں ہمی گفتی (مولانا جامی)

قطران تبریزی پانچویں صدی ہجری میں ایک زبردست اور قادرالکلام شاعر گزرا ہے لیکن باوجود اس استعداد اور قوت کے اس کے کلام نے وہ شہرت نہیں پائی جس کا وہ مستحق تھا۔ چونکہ اتفاق سے اس کے ایک ممدوح کا نام ابونصر مملان تھا اس لیے ناواقفیت سے لوگوں نے اس کو نصر بن احمد سمجھ کر قطران تبریزی کا کُل کلام رودکی کی طرف منسوب کر دیا اور یہ غلطی یہاں تک شائع ہوئی کہ بعض لوگ یہ سمجھنے لگے کہ حکیم رودکی کا تخلص قطران تھا۔ تذکرۂ مجمع الفصحا کے مصنفوں کو قطران کا جو دیوان ملا اس پر یہ الفاظ لکھے تھے : "دیوانِ قطران مشہور بہ رودکی"۔ الغرض یہ خیال ایک عرصہ تک دائر و سائر رہا۔ اور اکثر قطران کے اشعار تذکروں اور تاریخوں میں رودکی کے نام سے درج ہوتے رہے۔ مصنفانِ تذکرہ مجمع الفصحا کا فارسی شاعری پر بڑا احسان ہے جنھوں نے پہلی مرتبہ اس غلطی کا اظہار کیا اور رودکی کا سب کلام دنیا کے سامنے پیش کیا جس میں کسی دوسرے شخص

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے کلام کے اختلاط کا شبہ بہت کم ہے۔

وفات

رودکی کی تاریخ پیدائش کسی تاریخ یا تذکرہ میں نہیں بتائی گئی ہے لیکن اس قیاس پر کہ تکمیل تعلیم اور شاعری میں شہرت اور نام آوری حاصل کرنے کے لیے ذہین سے ذہین اور طباع سے طباع شخص کو بھی کم سے کم ۳۰ - ۳۵ سال درکار ہوتے ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۳۱۰ ہجری میں جس کو امیر نصر کے عین شباب اور سنِ شعور کا زمانہ سمجھنا چاہیے اور جس سے پہلے اس کا رودکی کو اپنے ندما میں شریک کرنا بالکل خلافِ قیاس ہے، رودکی کی عمر ۳۰ - ۳۵ برس کی ہوگی۔ اس قیاسی حساب سے اس کا سنِ پیدائش ۲۷۵ یا ۲۸۰ ہجری قرار پاتا ہے۔

خلفائے بنی امیہ اور خلفائے بنی عباس کے عہد میں شعرا کی بہت کچھ قدریں ہو چکی تھیں اور خاندانِ برامکہ نے اپنی داد و دہش سے شاہانِ سابق کی فیاضی اور دریا دلی کے تمام کارنامے مٹا دیے تھے، مگر اس پر بھی امیر نصر نے اپنی حیثیت کے موافق رودکی کے ساتھ جو فیاضانہ سلوک کیا وہ یادگار ہے اور آج تک اس کی مثال دی جاتی ہے۔ ۳۳۱ھ میں امیر نصر نے تقریباً تیس سال حکمراں رہنے کے بعد ۳۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ رودکی کو نصر جیسے فیاض سرپرست کے اُٹھ جانے سے جو صدمہ ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے اور ممکن نہیں کہ اس کی متاثر طبیعت نے اس کو اس موقعہ پر خاموش رہنے دیا ہو۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کے موجودہ کلام میں امیر نصر کا کوئی مرثیہ یا نوحہ نہیں پایا جاتا۔ امیر نصر کے بعد اس کا بیٹا نوح بن نصر تخت نشین ہوا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوح بن نصر اور عبدالملک کے زمانہ میں بھی وہ بہ فراغت بسر کرتا رہا لیکن نصر کے زمانہ کا وہ عیش و آرام کہاں تھا۔ خود اس کے شباب کا زمانہ بھی گزر چکا تھا اور بڑھاپے نے طبیعت کی گرمی کو سردی سے بدل دیا تھا۔ اور اب بجز شکایتِ پیری اور حسرتِ جوانی کے کیا رہ گیا تھا۔ چنانچہ ایک قصیدے میں خود اس نے جو تصویر کھینچی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رودکی نے اچھی عمر پائی اور آلِ سامان کی فیاضیوں کی بدولت فارغ البالی سے زندگی بسر کر کے ۳۴۳ھ میں انتقال کیا۔

© rasailojaraid.com